پندرہ روزہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علیگ

● علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔
● ہر مہینہ کی پانچ اور بیس کو شائع ہوتا ہے۔

ششماہی ایک روپیہ
فی پرچہ بارہ نئے پیسے

دوسرا سال جلد ۲	۲۰ ستمبر ۱۹۵۷ء	نمبر ۵

الیکشن

اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ہماری یونین کے الیکشن ہونے والے ہیں۔ یونین ایک جمہوری ادارہ ہے اور جس طرح ہر جمہوری ادارے میں الیکشن کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اسی طرح ہماری یونین کے الیکشن بھی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ الیکشن کا موقع بڑی آزمائش کا موقع ہے۔ اگر آپ ذرا بھی لاپرواہی یا غیر سنجیدگی برتیں گے تو اچھے لوگوں کی جگہ برے لوگ منتخب ہو کر آجائیں گے جو نہ صرف یونین کا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکیں گے بلکہ آپ کے صحیح نمائندے بھی نہ ہوں گے۔ الیکشن کے موقع پر ہم سب کو اپنی سنجیدگی سوجھ بوجھ اور ذمہ داری کا بہترین ثبوت دینا چاہیئے۔

یونین کے مختلف عہدوں کے لئے امیدوار آپ سے ووٹ مانگنے آئیں گے۔ اپنے تعلقات، قابلیت یا ہم مسلک ہونے کے ناطے آپ سے ووٹ مانگیں گے الیکشن اور یونین کے بارے میں سبز باغ دکھائیں گے مینیفسٹو میں بڑے بڑے وعدے کریں گے۔ آپ کو ان میں سے کسی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ اگر آپ یونین کے بہی خواہ ہیں تو عہدیداروں کے انتخاب میں سخت ترین تنقیدی نظر سے کام لیجئے۔ آپکے انتخاب میں دوستی کا کوئی رشتہ، تعلقات کی کوئی کشش، شخصی دلچسپی کا کوئی خیال مخل نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ اپنی پوری ذمہ داری اور بردباری سے اچھے لوگوں کو منتخب کیجئے۔ ایسے لوگوں کو جو اس کے اہل ہوں، ایماندار ہوں اور یونیورسٹی کے مفاد کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

ایسے لوگوں کو ہرگز منتخب مت کیجئے جو تقریر کی بازی گری سے اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں جذبات سے کھیلنے والوں، لچھے دار تقریر کرنے والوں اور سوانگ بھرنے والوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آج بھی مقرروں سے زیادہ ٹھوس کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔

ایسے لوگوں سے بھی ہوشیار رہیئے جو یونین کو اپنی پارٹی کے نظریات کی اشاعت کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور اس کے پلیٹ فارم کو کسی ایک گروپ کے لئے محدود کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کو تو ایسے مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے جو یونین کو بلا امتیاز فکر و مذہب ایسا جمہوری ادارہ بنائیں جو ہر نقطۂ نظر اور مذہب کے ماننے والوں کی نمائندگی کرے۔ اور جہاں علی گڑھ کی اعلیٰ روایات کچلی نہ جائیں بلکہ پھل پھول سکیں۔ یونین کو ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جن کے کاموں میں جوش، بے غرضی اور عمل سب سے نمایاں ہو، جن کا مقصد یونین کے ذریعہ اپنی ذاتی اغراض و مطامع پورا کرنا نہ ہو بلکہ خدمت اور ٹھوس کام ان کا نصب العین ہو اور صرف ایسے مقرروں کی ضرورت ہے جنکی تقریروں میں جوش کے ساتھ علم ہو، گہرائی ہو، وقار ہو۔

ہمیں آپ سے پوری امید ہے کہ آپ سنجیدگی کے ساتھ اپنی تنقیدی نظر سے کام لے کر اس موقع پر اچھے امیدوار منتخب کرکے یونین سے اپنی وابستگی اور اس کے مفادات سے دلچسپی کا ثبوت دیں گے۔ اور اسی طرح اپنی یونین کو ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ایک نمونہ کی یونین بنائیں گے۔

علیگ کا اگلا شمارہ "سرسید نمبر" ہوگا۔
جو یوم سرسید (۱۷ اکتوبر) کو شائع ہوگا

اک عرضِ تمنّا ہے ۔۔۔۔

یونیورسٹی میں ایک مرکزی شعبۂ اشاعت کی ضرورت

● کسی بھی یونیورسٹی کے قیام کا صرف ایک اور ایک ہی بنیادی مقصد ہو سکتا ہے ۔ علم کی ترویج و اشاعت ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مختلف النوع ذرائع استعمال کئے جاتے رہے ہیں ۔ ان ذرائعوں میں سب سے زیادہ عام (اور غالباً سب سے زیادہ سہل اور ناکافی بھی) ذریعہ یہ رہا ہے کہ چار دیواروں ، اور ایک چھت پر مشتمل کسی عمارت میں ، طلبہ کی ایک مقررہ تعداد کو بٹھا کر ، ہر روز چار پانچ لیکچر پلا دئے جائیں ۔ یہ نسخہ کافی آزمودہ ہے ، اور قدیم ہے اس پر کامیابی یا ناکامیابی سے عمل ہو رہا ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ یونیورسٹی اگر قوم کا دل نہیں تو دماغ ضرور ہوا کرتی ہے ۔ یہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں ملک کے بہترین دانشور جمع ہوتے ہیں ۔ وقت کے ملبے میں دبی ہوئی دستاویزیں برآمد کی جاتی ہیں ۔ علم کی گمشدہ کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے ، پرانے سرمایہ کی چھان پھٹک کی جاتی ہے اور مستند اور غیر مستند کو رد و قبول کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے ۔ یہاں بھانت بھانت کے خیالات ٹکراتے ہیں اور اس تصادم کی کوکھ سے نئے خیالات جنم لیتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ یہاں نہ صرف ماضی کے ورثے کو سمیٹا جاتا ہے بلکہ مستقبل کے لئے نئی راہیں بھی دریافت کی جاتی ہیں ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سارا علم ، یہ ساری تحقیق ، یہ ساری جستجو صرف گوشے میں بند ہو کر رہ جائے تو کس کام کی! پرانے یونان کا وہ دور گذر گیا جب علم کی اشاعت کا واحد ذریعہ شہر کی سڑکوں پر کھڑے ہو کر ، برسرِ عام مباحثہ ، مناظرہ اور تقریر کرنا تھا ۔ قرونِ وسطیٰ کا وہ دور بھی جانے کب کا بیت چکا ہے جب منشیوں کی عمر بھر کی عرق ریزیوں کا ثمرہ بھیڑ کی کھالوں یا ہاتھ سے بنے ہوئے کاغذ پر نقش ہو کر خانقاہ کے کتب خانے کی زینت بن جاتا تھا ۔ آج پانچ سو برس سے بھی زیادہ سے ، نوعِ انسان کو نہایت عظیم الشان پیمانے پر طباعت اور اشاعت کی ساری آسانیاں فراہم ہیں اور ان سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہے ۔

● قرونِ وسطیٰ میں بھی اور دورِ جدید میں بھی یونیورسٹیاں ہمیشہ علم کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز رہی ہیں ۔ ہمارے سامنے کیمبرج اور آکسفورڈ کی جیتی جاگتی مثالیں موجود ہیں ـــــ ان دو علمی مرکزوں کی شائع کی ہوئی کتابوں سے کم از کم مسلم یونیورسٹی لائبریری کی جسامت کی نصف درجن لائبریریاں بھری جا سکتی ہیں ـــــ اور امریکہ کی بھی تقریباً تمام یونیورسٹیاں مستند ، ٹھوس اور معیاری کتابوں کی اشاعت کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہیں ۔ ـــــ ہمارا خیال ہے کوئی بھی معقول شخص علم کی اشاعت کی ذمہ داری صرف کم علم ، کندۂ ناتراش اور بدنیت ناشروں پر نہیں چھوڑ سکتا ۔ یہ یونیورسٹی کا ایک ترجیحی اور مقدس فریضہ ہے ۔

● جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ہر شعبے کے اساتذہ کو (ص ۸ کالم ۲ پر)

”تلسی داس“ ـــــ از جے کرشن چودھری

(تبصرہ)

ہندی کے مشہور و معروف شاعر تلسی داس پر اردو میں یہ پہلی تصنیف ہے جس کے مصنف جے کرشن چودھری ہیں اور جو الہ آباد سے شائع ہوئی ہے ۔ مصنف کی دو اور کتابیں ”کالیداس“ اور ”بھرتری ہری“ اردو میں شائع ہو چکی ہیں ۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو ادب ہندوستان میں پھلنے اور پھولنے کے باوجود ، دوسری دیسی زبانوں سے بالکل بے نیاز رہا ہے اور اتنا بھی نہیں کہ دوسری زبانوں کے ممتاز شعرا پر محض تعارفی کتابیں بھی مل جائیں ۔ ہمیں جے کرشن جی کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کے طفیل اردو میں تلسی داس پر ایک تعارفی کتاب تو مل گئی ۔

زیرِ نظر کتاب تلسی داس کی حیات ، شاعری اور عہد پر پہلی مبسوط کتاب ہے جس میں اس کے مصنف نے تاریخ کی تاریکیوں میں سے کھنگال کھنگال کر تلسی داس کی زندگی کے حالات مرتب کئے ہیں اور اپنے رچے ہوئے شعری مذاق سے ان کی شاعری کا ایک متوازن تجزیہ پیش کیا ہے اور اس طرح یہ کتاب اردو میں ایک مفید تحقیقی کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

چودھری صاحب کا کہنا ہے کہ تلسی داس نے شمالی ہندوستان کے مذہبی اور مجلسی ماحول میں وہی خوشگوار تبدیلی پیدا کی جو ہزار ہا سال قبل گوتم بدھ نے اپنے عالمگیر پیغام سے کی ۔ دونوں نے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف کامیاب جہاد کیا ۔ اگر مہاتما بدھ نے اخوت کے اصول پر مجلسی نظام کی از سرِ نو تعمیر کی تو گوسائیں تلسی داس نے یہ تلقین کر کے کہ سب انسان نہ صرف برابر ہیں بلکہ یکساں طور پر خالق کے محبوب بیٹے ہیں ، بنی نوعِ انسان کے درمیان کبھی نہ ٹوٹنے والے چاہ و محبت کے رشتے قائم کر دئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاتما بدھ کے بعد دو ہزار سال تک کسی اور بڑی شخصیت نے ہندوستان کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا جتنا تلسی داس نے ۔

اس کتاب کی بہترین خوبی یہ ہے کہ اس میں تلسی داس کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ محض ایک شاعر ، ایک محوِ آتش نفس یا ایک بھگت کی ہی نہیں ، ان سب سے بڑھ کر انسانیت کے اس پیکر کی ابھرتی ہے جو مذہب کو انسان کے درمیان فتنہ و فساد کی نہیں محبت کی بنیاد سمجھتا ہے اور جس کے نزدیک خدا کی بہترین عبادت ، بنی نوعِ انسان سے محبت ہے ۔ ان کی شاعری کا یہ پہلو جس پر چودھری صاحب نے خاص طور سے زور دیا ہے ۔ یقیناً خود چودھری صاحب کے نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے ۔ چودھری صاحب نے تلسی داس کی شاعری پر بھی کافی بحث کی ہے اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں مثلاً بحیثیت شاعرِ جمہور ، معلمِ اخلاق ، نقاشِ فطرت ، مصورِ حسن ، مفسرِ جذبات ، شارحِ محبت ، سیرت نگار اور ماہرِ تشبیہات کافی روشنی ڈالی ہے ۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ان کی شاعرانہ شخصیت پورے طریقے سے نہیں ابھرتی ، اور کسی بھی طرح یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ یہ کتاب ایک ایسے شاعر پر لکھی گئی ہے جو مرتبہ کے اعتبار سے ہومر ، شیکسپیر ، سعدی اور غالب کا ہمسر تھا ۔ اس کا تو خود چودھری صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ وہ گریرسن کے مقابلہ کی بھی کتاب تصنیف نہیں کر سکے ۔ چودھری صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک تعارفی کتاب لکھ دی ، آنے والی نسلیں ان کے کام کو بہت آگے بڑھا سکتی ہیں ، ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتیں ۔

ڈاکٹر محمد حسن

(قمر رئیس)



شعبۂ اردو کے معلم، محکمۂ اطلاعات کے مہتمم اور سید محمود (مشرقی) ہوسٹل کے وارڈن ـــ ڈاکٹر محمد حسن کی شخصیت ایک ایسا پہلو دار آبگینہ ہے جس کی سادگی میں قوس و قزح کے رنگ چھپے ہوئے ہیں۔ اور یہ رنگ گہرے ہی نہیں ایک دوسرے سے اس طرح ہم آمیز ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ کر کے روشنی میں لانا یا ان کے اس باہمی امتزاج سے جو کیفیت پیدا ہو اور جو خط و خال بنیں اس کا تجزیہ کرنا نہ آسان ہے اور نہ ہی اس وقت اس کی گنجائش ہے۔ اسلئے ان کی شخصیت کے چند امتیازی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ بالخصوص وہ پہلو جو ان کے علی گڑھ کے قیام اور یہاں کی زندگی تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب علی گڑھ کی تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں اور اجتماعی زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں قلب و نظر کی جس بیداری کے ساتھ سوچتے ہیں اور جس گہرائی، نکتہ رسی اور بصیرت کے ساتھ ان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ کو اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ سنجیدگی کے ساتھ ان مسائل پر ان سے گفتگو کریں۔ علی گڑھ ان سے زیادہ مانوس نہ سہی لیکن وہ یہاں کی گلی گلی کوچہ کوچہ اور در و دیوار سے اسی طرح مانوس اور شناسا ہیں جس طرح لکھنؤ کی شاہراہوں سے جہاں "جستجو و آرزو" کی راز داں ہیں۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ لکھنؤ کے دورِ قیام میں ان کی زندگی کا بڑا حصہ مجاز (مرحوم) کی رفاقت اور قربت میں گذرا ہے۔ ظاہر ہے کہ علی گڑھ کے اس مطرب و مغنی کے نغموں کے جادو نے کچھ تو اثر کیا ہی ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کو خواہ آپ گھر میں دیکھیں، آفس میں یا کلاس میں، ہر ساعت اور ہر عالم میں وہ آپ کو اضطراب و عمل کا ایک پیکر نظر آئیں گے۔ ایک ایسا پیکر جسے نئی منزلوں کی تلاش ہے جس کی تابناکی کے سامنے تخلیق و تعمیر کی سربلندیاں سجدہ ریز ہیں اور جس کی حرارت سے فرسودہ روایات کی ہر زنجیر پگھل کر فرشِ راہ ہو جاتی ہے۔ علی گڑھ کی پاکیزہ روایات کا وہ بڑا احترام کرتے ہیں۔ لیکن روایات کو وہ ان کی تہذیبی اہمیت اور تعمیری صلاحیت کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور جو اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ان کے مقابل ایک بڑا سا استفہامیہ بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ہر قول و عمل اور تحریر و تقریر میں ان کے بیدار شعور کا عکس متحرک نظر آتا ہے۔ اور یہ وہ شعور ہے جو صرف مطالعہ اور مشاہدے کی دین نہیں بلکہ جو زندگی کے حسن و توانائی کے بھرپور احساس و ادراک سے پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معلم او ناقد ہی نہیں، ایک فنکار بھی ہیں۔ وہ ایک ناولٹ اور کم و بیش پچاس ڈراموں کے خالق ہیں اور ان میں وہ شاہکار ڈرامے بھی شامل ہیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے گرانقدر انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ڈرامے خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ان کی تخیلی اور جذباتی زندگی کی روداد ہیں۔ یہ ان کے وسیع تجربات، داخلی حادثات اور ماحول کے ان انعکاسات کا آئینہ ہیں جو زندگی کی وادیوں میں انھیں قدم قدم پر ملے۔ ڈاکٹر صاحب کے حوصلوں میں بلا کی استقامت اور کس بل ہے۔ بڑی سے بڑی پریشانی اور مصیبت کے وقت بھی آپ انھیں ہراساں یا اداس نہیں دیکھ سکتے۔ کبھی کبھی تو ان کی یہ ادائے مقاومت لوگوں کے لئے بڑی حیرت کا باعث ہوتی ہے۔

ادھر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری درسگاہ کی مجلسی زندگی میں ایک جمود، تعطل اور بے کیفی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری "دانشگاہ" میں ایسے دانشور کم ہیں جن کی صحبت میں زندگی کی قدر و حرکت کا احساس ہوتا ہے اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ فلسفہ ہو یا سیاسیات، ادب ہو یا عمرانیات، وہ کسی موضوع پر باتیں کرتے نہیں جھجکتے۔ ہاں ان کی گفتگو کا ایک معیار اور ان کے لہجہ میں ایک وقار ہوتا ہے اور وہ آسانی سے اس سطح سے نیچے نہیں اترتے۔ آپ ان کی صحبت میں بیٹھ کر کچھ لئے بغیر اٹھ ہی نہیں سکتے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب سیاست، رومانیت اور صحافت کی پُر پیچ گھاٹیوں سے گذر کر ادب کے میدان میں آئے ہیں۔ اس لئے ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان تینوں مسلکوں کے تجربات اور اثرات کا حصہ ہے۔ بحیثیت معلم وہ اپنے فرائض کو جس ذمہ داری، مستعدی اور خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔ اس کی روداد ان کے طالب علموں سے سنئے۔ اس سلسلہ میں وہ کسی قسم کی سہل پسندی یا کج روی کو ایسا جرم سمجھتے ہیں جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے نئے تعلیمی مسائل سے ڈاکٹر صاحب کو بڑی دلچسپی ہے اور اگرچہ بعض جزوی باتوں اور عملی پہلوؤں میں وہ ذاکر صاحب کی دیدہ وری کے قائل ہیں لیکن کچھ بنیادی مسائل پر ان کے خیالات سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ طالب علموں کی ذہنی اور فکری نشو و نما کے لئے وہ آزادی اور کھلی فضا کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور وہ اسے اس حد تک ضروری جانتے ہیں کہ اگر ان کی آزادی کی حد بندی یا حصار بھی کیا جائے تو خشت کی دیواروں سے [illegible] نظر نہ آئیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج کے حالات اور نظام میں نہ تو اس آزادی کا امکان ہے اور نہ ہی طالب علموں کے اس ذہنی ارتقا اور ارتفاع کا۔

آئی۔سی۔بی۔ایم ● مسئلہ شام ● تخفیف اسلحہ

(اے۔ جان قیصر)

ایک سو دس سال قبل مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھا تھا کہ "یورپ پر ایک بھوت منڈلا رہا ہے اور وہ ہے کمیونزم"۔ آج ۱۹۵۷ء میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "دنیا پر ایک بھوت منڈلا رہا ہے اور وہ ہے آئی۔سی۔بی۔ایم یعنی —— (Inter Continental Ballistic Missile) ——

آئی۔سی۔بی۔ایم یا "آخری ہتھیار" کی مدد سے دنیا کے کسی بھی خطہ کو ایٹمی حملہ کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور فی الحال کوئی بھی ہتھیار اس کے حملہ کو روکنے سے قاصر ہے۔

روس کی اس انقلابی ایجاد سے دنیا کی سیاسی بساط کے نقشے میں اہم اثرات کے امکانات ہیں۔ اول یہ کہ اب امریکہ اور روس فوجی اعتبار سے کلی طور پر ایک دوسرے کی زد میں آ گئے ہیں اور فی الحال روس کو آئی۔سی۔بی۔ایم کے باعث امریکہ پر فوقیت حاصل ہے۔ پہلے دونوں طاقتوں کے پاس ایٹم اور ہائیڈروجن بم تھے اور اس طرح دنیا میں ایک قسم کا فوجی توازن تھا۔ جسے فرانس کے ایک اخبار نے EQUILIBRIUM OF TERROR سے موسوم کیا تھا۔ لیکن اب یہ توازن مفقود ہو گیا ہے (جب تک کہ امریکہ بھی اس آخری ہتھیار کو تیار نہ کرے) اس فوقیت کی بنا پر روس کو نفسیاتی طور سے اپنی طاقت پر زیادہ اعتماد ہو گا جو مغربی طاقتوں کے نقطۂ نگاہ سے اعصابی جنگ کو تیز تر کر دے گا۔

دوسرا اثر امریکہ کے بیرونی فوجی اڈوں پر ہو گا۔ جیسی جانتے ہیں کہ یہ فوجی اڈے کمیونزم کی وسعت کے خلاف سابق امریکی صدر ٹرومین کے "گھیراؤ کے نظریہ" (Theory of Containment) کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ تمام اڈے کمیونسٹ ممالک کے ارد گرد قائم ہیں اور اس طرح ان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ امریکہ ان اڈوں کو جنگ کے موقع پر کمیونسٹ ممالک کے خلاف استعمال کر کے انہیں ناکارہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ تخفیف اسلحہ کی سب کمیٹی (لندن) میں روس کی جانب سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ تمام بیرونی فوجی اڈے ہٹا لئے جائیں۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ امریکہ پہلے اس تجویز پر بھی رضامند ہو سکتا تھا تو اب یہ سراسر ناممکن ہو گیا ہے۔ امریکی نقطۂ نگاہ سے آئی۔سی۔بی۔ایم کے وجود سے روس کی فوجی طاقت میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ہے اس لئے اسے ان اڈوں کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اسلئے وہ ان کو ہٹانے پر کبھی تیار نہ ہو گا۔

○

روسی وزیر خارجہ اندری گرومیکو نے حال ہی میں مغربی طاقتوں کو خبردار کیا ہے کہ اگر شام میں جنگ چھڑی تو اسے صرف شام ہی تک محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یقینی طور سے یہ بیان آئی۔سی۔بی۔ایم کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ جس طرح روس کی دھمکی نے جنگ سوئیز کو جلد ہی ختم کر دیا اسی طرح شام میں بھی ہو۔ اس دھمکی کا مقابلہ ہم امریکہ کے Mass Retaliation کے اعلان سے کر سکتے ہیں جب کہ امریکہ نے انڈو چائنا کی جنگ میں کمیونسٹ چین کے خیالی مداخلت کے بارے میں دھمکی دی تھی۔ چین کی مداخلت کا ثبوت تو امریکہ بہم نہیں کر سکا لیکن مشرق وسطیٰ اور خصوصاً شام میں امریکہ کی ریشہ دوانیاں صاف طور سے سب کے سامنے آ گئی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی صورت حال کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے جو اپنی خطرناک پالیسی یعنی "آئزن ہاور منصوبہ" پر عمل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ حال ہی میں برطانوی لیبر پارٹی کے لیڈر ایڈورڈ ہیوگن نے ان الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر تیسری جنگ عظیم ہو گی تو وہ شام سے شروع ہو گی اور اس کا باعث آئزن ہاور منصوبہ ہو گا۔ نہرو نے ناصر نے ایک بیان دیا ہے "امریکہ کے نزدیک شام کا جرم یہ ہے کہ اس نے امریکہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کیوں نہیں کیا۔ اگر شام بھی اپنا سر تسلیم اسی طرح خم کر دیتا جیسا دوسروں نے کیا تو اس پر ہر طرف سے ڈالر اور ہائیڈروجن ڈالا جاتا اور دنیا کو یہ افسانے گڑھ گڑھ کر سنائے جاتے کہ شام میں کمیونسٹ گھس گئے ہیں اور دمشق مستقبل قریب میں ماسکو کے حلقۂ اثر میں شامل ہونے والا ہے"۔ عالمی کمیونزم کا ایک خیالی بھوت دکھا کر اور شام کے خیالی حملہ کے بارے میں واویلا مچا کر امریکہ نے چند عرب ممالک کے جاگیردارانہ عناصر سے سمجھوتہ کر کے اور انھیں اپنے زیر اثر لا کر عرب ممالک کے اتحاد میں رخنہ اندازی کی کوشش کی ہے۔ باطنی طور پر یہ مصر کے خلاف کارروائی ہے جو عرب لیگ کی رہبری میں پیش پیش ہے۔

معلوم نہیں امریکہ کب تک عالمی کمیونزم کے نعرے لگا کر چند رجعت پسند حکومتوں کو اپنے مفاد کی خاطر پیہ قوت بناتا رہے گا۔ (اگر نظر غائر سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ موجودہ صورت حال میں عالمی کیمونزم ہے ہی نہیں۔ "کومن فارم" ہے اور نہ "کومن ٹرن"۔ پروفیسر Toynbee نے اظہار خیال کیا ہے کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ عالمی انقلاب کے مارکسی نظریہ کا وہی حشر ہو جو اسلام کے مقدس جہاد کا ہوا؟ ...... ان کے خیال کے مطابق عالمی کیمونزم یا انقلاب کا مارکسی نظریہ اس وقت ختم ہو گیا جب ٹراٹسکی اور سٹالن کے مابین کی کشمکش میں اسٹالن کو فتح نصیب ہوئی)۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی ملک خود کو کمیونسٹ کہتا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ روس کا غلام ہو گیا ہے۔ چین کی مثال سامنے رکھئے۔ پھر لطف یہ ہے کہ شام کی وزارت میں کوئی بھی وزیر شام کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ امریکہ نے یہ سوانگ رچایا ہے کہ شام اپنے ہمسایہ ملکوں پر حملہ کر دیگا یہ سراسر پوچ اور دور از قیاس پروپیگنڈا ہے۔ شام خود چاروں طرف سے پانچ ملکوں سے گھرا ہے یعنی اردن، لبنان، عراق، ترکی اور اسرائیل۔ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اگر آئی۔سی۔بی۔ایم کا خطرہ نہ ہوتا اور مقتدر گرومیکو نے دھمکی نہ دی ہوتی تو اب تک شام پر پڑوسی عرب ممالک کی آڑ سے حملہ کر دیا گیا ہوتا۔

شام کا مسئلہ زیادہ تر معاشی مسئلہ ہے۔ امریکہ کی مالی امداد شام کو کیسی مل سکتی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آئزن ہاور منصوبہ کے تحت مغربی ایشیا کے بارہ ممالک کے لئے صرف دو سو ملین ڈالر رکھی گئی ہے۔ شام نے جب روس کی طرف رجوع کیا تو خالد العظم کے مشن کو جو ماسکو بھیجی گئی تھی (دمشق) ۔۔۔

روس نے تین ہزار ملاکھ ڈالر کی امداد کا وعدہ کیا اور معاہدہ کی تکمیل ہو چکی ہے۔ مصر کے ساتھ بھی اسوان باندھ کے معاملے میں یہی واقعہ پیش آیا اور پھر مصر کو کمیونسٹ ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ دوسری بات جو امریکہ کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ شام کی موجودہ حکومت بھارت، مصر اور یوگوسلاویہ کی طرح غیر جانب داری کی پالیسی اختیار کرنا چاہتی ہے اور امریکہ کی ڈکشنری میں غیر جانب داری برابر ہے کمیونسٹ ہونے کے۔

○

۱۰ ستمبر کو پنڈت نہرو نے آئی سی بی ایم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہتھیار انسان کی ضمیر اور ذہن کو ذرا اور جھنجھوڑ دے گا۔ یعنی انسانی ذہن امن کی حفاظت کے باب میں اور زیادہ تندہی اور سنجیدگی سے سوچے گا لیکن بات بالکل اس کے برعکس ہوئی۔ تخفیف اسلحہ کی سب کمیٹی (لندن) ساڑھے پانچ ماہ کی مسلسل گفتگو کے بعد بھی بالکل ناکامیاب رہی۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلحہ کی دوڑ کو روکنا اور مختلف طاقتوں کے درمیان ایٹمی اور ہائڈروجن ہتھیار بنانے کا جو مقابلہ ہو رہا ہے اس کا سد باب کرنا انتہائی اہم کام ہے۔ کوئی بھی باشعور فرد اس بات سے قطعی بے اعتنا نہیں رہ سکتا کہ تخفیف اسلحہ کے مسئلے کے متعلق کون سی حکومت کیا پالیسی اختیار کرتی ہے۔ بھارت کی پوزیشن بالکل صاف ہے۔ اول ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائش کو فوراً اور غیر مشروط طور پر روک دیا جائے۔ دوئم دوسرے ملکوں سے تمام بیرونی فوجی اڈے ہٹا لئے جائیں۔ سوئم تمام فوجی معاہدوں کو توڑ دیا جائے۔ روس ان تمام تجاویز کو قبول کرتا ہے بلکہ ایٹمی ہتھیاروں کو برباد کرنے پر بھی تیار ہے۔ دوسری طرف مغربی طاقتوں کا کہنا ہے کہ تخفیف اسلحہ کا کوئی مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ بین الاقوامی سیاسی مسئلے جن پر جھگڑا ہے حل نہ ہو جائیں (ان کے خیال سے اولین اور اہم ترین مسئلہ جرمنی کا ہے) لیکن تخفیف اسلحہ کے کسی ایک یا دوسرے پہلو پر سمجھوتے کے لئے یہ لازمی شرط رکھ دینا کہ پہلے تصفیہ طلب بین الاقوامی سیاسی مسائل طے ہو جائیں سمجھوتہ میں پہلے ہی سے ناکامی کا یقین دلانا ہے۔ سوویٹ یونین نے صاف کہہ دیا ہے کہ جرمنی کے مسئلے کے متعلق چار طاقتی کانفرنس میں اس کے شریک ہونے کا قطعی ارادہ نہیں ہے کیونکہ اس وقت یہ سوال دونوں جرمن ریاستیں آپس میں خود ہی گفتگو کے ذریعہ حل کر سکتی ہیں۔ اس لئے سب کمیٹی میں مغربی طاقتوں نے جو تجاویز پیش کی تھیں وہ دونوں فریقوں میں قربت پیدا کرنے کے بجائے در اصل تخفیف اسلحہ کے مسئلہ کو کلی یا جزوی طور پر حل کرنے کے امکان کا راستہ ہی مسدود کر دیتی ہیں۔

اب بھی جو وقت انسان کو حاصل ہے اس سے فائدہ اٹھا کر وہ اسلحہ بندی کی دوڑ کو روک دے ورنہ اگر ایک دفعہ بھی عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑک گئے تو پھر سوچنے کا یہ وقت بھی میسر نہ ہو گا۔

ہال پوسٹس کا اعلان

مختلف ہالوں کے مختلف عہدیداروں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۸) میں نے ان کے دونوں کان چھو کر معافی مانگی۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور مالی کو آواز دے کر کہا کہ باندھ دو اس گدھے کو اور کر دو اس کی رپورٹ پرووسٹ سے اور دلوا دو اس کو پوسٹل شفٹ۔

میں ان بزرگ کے اس رویہ سے بہت گھبرایا۔ ایک طرف تو ہم کو زیدی صاحب کا بین الحیواناتی ہمدردی کا وہ رویہ یاد آ رہا تھا اور دوسری طرف ان کی یہ ڈانٹ۔ ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

مالی رسی لے کر آ گیا اور میری فریاد سے کام نہ چلا تو میں نے ایک لات چلائی اور بھاگا۔ میرے پیچھے پیچھے بیروں کی ایک فوج دوڑا دی گئی۔ مگر میں نے سیدھے زیدی صاحب کے آفس میں جا کر دم لیا۔ میں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ سیدھا آفس میں جا پہنچا۔ میرے پیچھے پیچھے چپراسی دوڑا آیا۔ ان کے پیچھے پرووسٹ صاحب۔ اس وقت زیدی صاحب کے پاس کچھ پروفیسر بیٹھے تھے جن سے وہ یونیورسٹی کے معاملات پر گفتگو فرما رہے تھے۔ سب لوگ مجھے اس طرح گھور رہے تھے گویا میں گدھا نہیں کچھ اور ہوں۔

(باقی آئندہ)

(بقیہ صفحہ ۲ کالم ۱) اچھی کتابیں شائع کرنے کے لئے یونیورسٹی کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے لیکن یہ اقدام جتنے نیک ہیں اتنے ہی زیادہ غیر منظم۔ ایک بار کتابیں شائع ہو جاتی ہیں اس کے بعد کوئی بازپرس نہیں ہوتی کہ آیا یہ کتابیں علمی حلقوں میں یا عام لوگوں تک پہنچیں یا ڈپارٹمنٹ کی کسی تاریک کوٹھری میں مقفل ہو کر دیمکوں کی خوراک بن گئیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ان کتابوں کو قیمتاً بیچنے کی بھی اجازت نہیں ہے اس لئے کہ یونیورسٹی کے رجسٹروں میں صرف خرچ کا کالم ہے آمدنی کا کوئی کالم ایک سرے سے ہے نہیں۔

● موجودہ حالات کے پیش نظر مندرجہ ذیل چند تجاویز قابل غور ہیں۔ یونیورسٹی کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا ایک مرکزی شعبہ کھولا جائے جس میں اساتذہ کی اور کورس کی کتابیں شائع کی جائیں اور کتابوں کی فروخت کا معقول انتظام کیا جائے۔ تاکہ یہ کتابیں اس یونیورسٹی سے نکل کر ملک کے مختلف علمی حلقوں اور عام آدمیوں تک پہنچیں اور اس آمدنی سے مصنف کو معقول رائلٹی بھی مل سکے اور آمدنی کے باقی حصے کو دوبارہ Invest کیا جا سکے۔

یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کے فیصلے

۱۲ ستمبر کو یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نے مندرجہ ذیل فیصلے کئے ہیں۔

● شعبہ تاریخ میں ہندوستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند اور ڈاکٹر آر ایس ترپاٹھی کے اعزازی تقرر بحیثیت پروفیسر کی تصدیق کر دی۔

● مشہور ماہر چشم ڈاکٹر تلسی داس کا تقرر انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمولوجی میں بحیثیت پروفیسر ۲۰۰۰ روپیہ ماہانہ پر کیا۔

● ویمنس ہال کے نام کو تبدیل کر کے عبداللہ ہال کر دیا

یہ پندرہ دن

"ایٹم برائے امن" نمائش

یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس کی طرف ایٹم برائے امن کی نمائش آجکل اسٹریچی سینٹرل ہال میں دکھائی جارہی ہے۔ اس نمائش کا افتتاحی جلسہ کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں ۵ر ستمبر کی شام کو اسٹریچی ہال کے سامنے منعقد ہوا۔ افتتاحی خطبہ جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے پڑھا۔ اس نمائش کا مقصد عام لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ ایٹم کو ہم کس طرح امن کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ نمائش میں ایٹمی توانائی کے اُن مختلف استعمالات پر تصاویر اور ماڈلوں کی مدد سے روشنی ڈالی جارہی ہے جو امن کے لئے ہیں۔

علی گڑھ میں سیلاب

مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے شرمدان کرکے بند باندھا

پچھلے چند روز سے علی گڑھ میں سیلاب کا بہت زور ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے علی گڑھ کے چند دیہاتوں اور شہر کے چند محلوں کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ آخری اطلاع ہے کہ سیلاب کا پانی کم نہیں ہورہا ہے۔

سب سے پہلے ۱۷ر ستمبر کو بھولا گاؤں کے لوگوں نے سیلاب کا مقابلہ کیا۔ اور پانی کو روکا۔ اطلاع ملتے ہی شام کو یونیورسٹی اور ضلع کے ذمہ داروں نے گاؤں کا جائزہ لیا۔ رات کو یونیورسٹی کے طلباء اور گاؤں والوں نے مل کر بند باندھا۔ اور پانی کو روکنے کی کوشش کی مگر پانی برابر بڑھتا رہا۔ ۱۸ر ستمبر کو انجینیرنگ پالی ٹیکنک کے طلباء اور اساتذہ نے پانی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انجینیرنگ کے طلباء کے ساتھ اور طلباء بھی شامل ہوگئے اور رات کو بند کی حفاظت کی۔ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ زیدی صاحب نے دن میں کئی مرتبہ سیلاب زدہ علاقوں کا معائنہ کیا۔ زیدی صاحب نے بلڈنگ ڈپارٹمنٹ اور دوسرے کنٹریکٹرس سے کہہ کر تمام مزدوروں کو کام سے ہٹا کر پانی روکنے کے لئے بھیج دیا۔ پانی کا LEVEL برابر بڑھا تو ۱۹ر ستمبر کو یونیورسٹی کے طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد نے پوری طاقت سے دن بھر پانی کو روکنے کی کوشش کی۔ طلباء کو پانی میں کھڑے ہوکر لہروں کو روکنا پڑا۔ یہ دن خطرناک تھا کیونکہ کسی بھی وقت بند کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ رات کو طلباء نے بھولا گاؤں کے لوگوں کے ساتھ مل کر بند کی حفاظت کی۔ ساڑھے دس بجے رات کو بروہ موضع کی طرف کا بند ٹوٹ گیا تو طلباء نے بڑی جانفشانی سے اس بند کی مرمت کی۔ ۲۰ر ستمبر کو طلباء برابر بند پر موجود ہیں اور پانی کو روکنے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔

شہر میں بعض لوگوں نے یہ افواہ یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لئے اُڑائی ہے کہ جو بند طلبا نے باندھا ہے اس کی وجہ سے شہر میں پانی جارہا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ اگر بند نہ باندھا گیا ہوتا تو شہر کو کہیں زیادہ نقصان ہوتا۔ م م

یونین میں اسلام پر تقاریر کا سلسلہ

اس سال اسلام پر تقاریر کے سلسلے کا آغاز مولانا عبدالسلام ندوی کی تقریر سے ۷ر ستمبر کو یونین ہال میں ہوا۔ مولانا کی تقریر کا موضوع تھا "اسلام اور موجودہ مسائل"۔ ۹ر ستمبر کو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اسلامی نظام معیشت کے اجتماعی پہلو پر ایک پُر مغز تقریر کی۔ ڈاکٹر اشرف نے ۱۰ر ستمبر کو "اسلام اور جمہوریت" پر تقریر کی۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی شواہد کی مدد سے یہ بات ثابت کی کہ اسلام میں جمہوریت کا تصور کبھی نہیں رہا ہے۔ انھوں نے اسلام میں انصاف کے تصور پر روشنی ڈالی۔ اور اس تصور کو جمہوریت سے بالکل الگ قرار دیا۔

صدر یونین کی ماسکو سے واپسی

سید ضیاء الحسن ہاشمی صدر یونین جو چھٹے عالمی نوجوانوں کے میلے میں شرکت کے لئے ماسکو گئے ہوئے تھے ۸ر ستمبر کو ماسکو سے واپس علی گڑھ آگئے۔ ضیاء صاحب کو یونین میں ۱۰ر ستمبر کو خوش آمدید کہا گیا۔ اس میٹنگ میں انھوں نے اپنے سوویٹ یونین کے سفر کے تاثرات وغیرہ بتائے۔ انھوں نے کہا کہ سوویٹ یونین میں مذہب کی آزادی ہے۔ "وہاں مسلمان ہیں۔ مسجدیں ہیں" وہ خود بھی ایک مسجد میں نماز کے لئے گئے۔ "نماز میں زیادہ تر بوڑھے مسلمان تھے۔ نوجوان مذہب کی طرف سے لاپرواہ ہیں"۔ انھوں نے ہندوستان کے وفد کے متعلق بتایا کہ وہ ایک نمائندہ وفد نہ تھا اور جو حرکتیں ہندوستان کے نمائندوں نے وہاں کیں وہ قابل مذمت ہیں۔

"انجمن اقوام متحدہ کا وجود عالمی امن کا ضامن ہے"

۱۵ر ستمبر کو یونین میں اس سال کی پہلی انعامی اردو ڈبیٹ منعقد ہوئی جس میں ۱۸ مقررین نے حصہ لیا۔ مباحثے کا موضوع تھا "انجمن اقوام متحدہ کا وجود عالمی امن کا ضامن ہے"۔ عابد اللہ غازی، شبیر احمد اور ضمیر احمد کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام ملا۔ ججز کے فرائض نسیم قریشی صاحب اور احمد سعید صاحب نے انجام دئے۔

"قیام امن کے لئے جنگ کی تیاری ضروری ہے"

۱۶ر ستمبر کو پہلی انعامی انگریزی کی ڈبیٹ یونین میں ہوئی۔ مباحثہ کا موضوع تھا "قیام امن کے لئے جنگ کی تیاری ضروری ہے"۔ شبیر احمد کو پہلا، ایم۔ اے کریم کو دوسرا اور عابد اللہ غازی کو تیسرا انعام ملا

یونیورسٹی میں "پلان ویک"

شعبہ معاشیات کے پلاننگ فورم کی طرف سے ۱۷ سے ۲۳ر ستمبر تک پلان ویک منایا گیا۔ چارٹ، پمفلٹ اور کتابوں کی نمائش کے ذریعہ دوسرے پلان کی ترقی پر روشنی ڈالی گئی۔

اس موقع پر طلباء نے جس جوش سے کام کرکے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں وہ انتہائی قابل تحسین و ستائش ہے۔

ایک گدھے کی سرگزشت

(حضرات! میں گدھا ہوں، میرا باپ بھی گدھا تھا۔ میں وہی ہوں جس کی داستان آپ کو کرشن چندر سُنا چکے۔ اب میں نے علی گڑھ میں داخلہ لے لیا ہے۔ جلیگا میں آپ سے مستقل ملاقات رہے گی۔)

دوستو! میں آج علی گڑھ میں فرسٹ ائیر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرے حالات اس قابل کہاں تھے۔ مگر ادھر ان دنوں میری قسمت کا ستارہ کافی عروج پر تھا۔ میں جب پنڈت جواہر لال نہرو سے ملا تھا مجھ کو ہرگز احساس نہ تھا کہ یہ ملاقات میرے لئے باعث شہرت ہوگی۔ حاشا وکلا میرا مقصد تو صرف رامو دھوبی کی بیوہ اور بچوں کے لئے امداد حاصل کرنا تھا۔

جب میرے بیمار ہوکر جانوروں کے اسپتال میں داخلہ کی خبر اخبار میں چھپی تو مجھے ایک جم غفیر نے گھیر لیا۔ سیٹھ من سکھ لال اور ان کی صاحبزادی کا طرز عمل میں بھولا نہ تھا اس لئے میں انسانوں کی ہمدردی سے گھبرانے لگا تھا اور ہر شخص کی ہمدردی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اس واقعہ کو دوسرا ہی دن تھا کہ مجھے معلوم ہوا مجھ سے ملاقات کیلئے زیدی صاحب، بیگم زیدی اور ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ مجھ سے ناکارہ گدھے پر اتنی یہ عنایات بھی کچھ خطرہ سے خالی نہ تھیں لیکن میں نے ان لوگوں کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا اور نرس سے کہا کہ ——— ان لوگوں کو اجازت دیدے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب نے فوراً گلے میں سے Stethoscope نکال کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مجھے بٹھا کر انھوں نے ٹکر ٹکر دیکھی پھر بولے ایکسرے کی سخت ضرورت ہے..... میں اس تمام واقعہ پر حیران و پریشان تھا۔ ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم والا معاملہ تھا۔

میں ان محترم سے بالکل واقف نہ تھا کہ یہ کون ہیں اور کیوں اتنی سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ البتہ میں نے زیدی صاحب کا نام سنا تھا اور مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ان جانشین سے ملنے کا کافی اشتیاق تھا۔ بیگم زیدی کو میں نے دہلی کے اکثر علمی، ادبی، اصلاحی، سیاسی، سماجی جلسوں، ڈراموں، کلچرل پروگراموں میں دیکھا تھا۔ ان کو دہلی کی زندگی میں خاص مقام حاصل ہے لیکن مجھے آج تک یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کون محترمہ ہیں..... بہرحال میں ان لوگوں کے اس اخلاق سے سخت شرمندہ تھا۔ کچھ تو گدھے ویسے بھی شرمیلے ہوتے ہیں اور مجھے تو ان لوگوں نے پانی پانی کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پیٹھ تھپتھپا کر دلاسا دلایا اور کہا کہ فکر مت کرو بالکل ٹھیک ہو۔ ہو سکے تو مکسچر کی تین خوراکیں پیو اور پنسلین کے چند انجکشن لے لینا۔ طاقت کے لئے وٹامن B اور کیلشیم کے انجکشن ہر دوسرے دن لیتے رہو۔ میں انجکشن سے بہت گھبراتا ہوں۔ میں کٹر قسم کا مشرقی گدھا ہوں۔ ویسے تو میں Naturotherapy میں یقین رکھتا ہوں۔ اگر علاج کی سخت ضرورت بھی پیش آجائے تو پھر میں یونانی یا ویدک علاج کو ترجیح دیتا ہوں۔ جڑی بوٹیاں میں اپنی گھاس میں ملا کر بآسانی کھا لیتا ہوں۔

میں اب تک بھی ان حضرات کی تشریف آوری کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ بار بار میرے دماغ میں سیٹھ من سکھ لال کے کاروبار کے کرشکیٹ پر دستخط کی بات ذہن میں گھوم رہی تھی۔ سچ ہے دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے..... تھوڑی دیر تک کمرے میں سکوت رہا۔ پھر اس طلسم خاموشی کو زیدی صاحب نے توڑا..... "محترم صاحب ہم لوگ آپ کی عیادت کے لئے آئے تھے۔ آپ کے چرچے ہم نے اخبارات میں سنے۔ حقیقت میں بہت بڑی ترقی ہے جو تم نے گدھا ہوتے ہوئے کی۔ اس مقام عزت کو تو اکثر انسان نہیں پہونچے"..... گدھا بنا انسان سے بھی ہے بڑھ کر

مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ!

میں نے یہ سن کر شرم سے اپنی گردن جھکا کر کان سکوڑ لئے۔ پھر بیگم زیدی نے زیدی صاحب کے منہ کا لقمہ چھین کر کہا "مسٹر ڈنکی! ہم لوگ تمہاری قابلیت سے خوش ہیں۔ خصوصیت سے جس طرح تمہیں پنڈت جواہر لال نے نوازا ہے اسکو دیکھتے ہوئے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم تمہاری ترقی میں معاون ہوں۔ ہمیں تم جیسے قوم پرست اور درویش بھگتوں، مقرروں اور سنگیوں کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے آپ کے پکے گانوں کی بہت تعریف سنی ہے۔ اسلئے ہمارے ہاں کلچرل پروگرام میں اچھے فنکاروں کی بہت کمی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیں اور اپنی تعلیم کی تکمیل کریں اور پھر وظیفہ لیکر امریکہ سے کوئی ڈگری لے آئیں"۔ میں بیگم زیدی کی اس تجویز پر جھوم گیا اور میں نے کہا "اس عنایت کا بہت بہت شکریہ یہ تو آپ کا حسن ظن ہے نہیں تو گدھا کس قابل ہے۔ جہاں تک امریکہ کی ڈگری کا تعلق ہے تو میں نے سُنا ہے کہ وہ انسانوں کے بعد اگر کسی کا حق ہے تو گھوڑوں کا ہے؟"..... سب لوگ میری اس بات پر ہنس دئے۔ زیدی صاحب نے کہا "پہلے آپ ایم اے تو کیجئے۔ آپ تو اپنے دور کے Pioneers میں سے ہیں۔ اتنے آپ ایم اے کریں گے اتنے امریکہ کیا تمام دنیا میں گدھوں کے لئے مخصوص اسکالرشپ نکل آئیں گے اور تعجب نہیں کہ مختلف یونیورسٹی میں "گدھیات" کے شعبے کھل جائیں"۔

میرے دل میں حقیقت تو یہ ہے کہ بور کے لاؤڈ سپیکر رہتے تھے۔ علم کا میں ہمیشہ سے شوقین ہوں۔ قابلیت مجھ میں ایم اے سے بھی زیادہ ہے لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے اس مقصد کی تھی جس کے لئے میں نکلا تھا یعنی رامو کی بیوہ کا کیا ہوگا؟ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو رامو کی بیوہ کے لئے معاوضہ کی جدوجہد۔ دوسرے اپنا شاندار تعلیمی مستقبل۔ ایسے مواقع روز روز نہیں آتے اور میں نے کچھ دن کے لئے رامو کی بیوہ کے خیال کو دل سے نکال کر میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے ڈالا۔

قصہ ناکامی کا گدھے کی لینے میں ایڈمیشن کے!

میں دلّی سے علی گڑھ دلکی چال آیا تھا پھر بھی کافی لیٹ ہو گیا تھا۔ ایک بڑی مشکل یہ بھی کہ میں شہر اقومی کارکن اور جن سیوک۔ میرے پاس پیسے وغیرہ بھی نہ تھے بڑی مجبوری یہ بھی کہ چونکہ میٹرک میں نے بیماری میں دیا تھا اس لئے میری تھرڈ ڈویژن آئی تھی۔ اپنے نتیجہ کو دیکھتے ہوئے میری ہمت نہ ہوئی کہ زیدی صاحب سے ملاقات کروں۔ میں نے خدا کا نام لے کر زیرِ ہمت کسی اور پروسٹ آفس کا راستہ لیا۔ راستہ ہی میں

مجھے ایک طالب علم ملا جو جگہ نہ ہونے کے سبب بے نیل و مرام لوٹ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اس ہال کو چھوڑ کر دوسرے ہال کا رخ کیا۔ دوسرے ہالوں میں عموماً اس قسم کے سوالات کیے گئے — آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کیا سیاسی نظریات ہیں؟ کیا آپ مقرر ہیں؟ کیا آپ ادبی ذوق رکھتے ہیں؟ الکشن لڑنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کمیونسٹ ہیں یا جماعت اسلامی کے؟

بدقسمتی سے میں نے ہر جگہ صاف صاف بتایا کہ میں تو خود ایک انجمن ہوں۔ میرا کسی جماعت سے کیا تعلق۔ رہا ادبی ذوق، تو وہ گدھوں میں کافی عام ہوتا جا رہا ہے۔ الیکشن لڑنے کو جمہوریت میں کون روک سکتا ہے۔ میری اس صاف گوئی سے لوگ متاثر تو کافی ہوئے مگر جواب میں ہمدردی کے لہجہ میں فرمایا معاف کیجئے ابھی تو ہمارے ہاں سیٹ نہیں۔ اگر ہوئی تو آپ کو ملے گی یعنی کنسیشن تک بات ہی نہ پہونچی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں انھوں نے میرے گدھا ہونے کے سبب تنگ نظری سے کام نہیں لیا بلکہ گدھا ہوتے ہوئے سینگ کی آرزو کو برا سمجھا۔

ادھر سب سے بڑا مسئلہ داخلہ کی فیس کا تھا۔ اب تک کہیں سے امید کی جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔ مجھ سے ایک سینئر نے جو میرے کافی ہمدرد ہو گئے تھے اور یونیورسٹی کے اسپورٹس مین تھے، اور ان کی خاص عادت ہر بات کے جواب میں "جی" کہنے کی تھی۔ مجھ سے از راہ شفقت فرمانے لگے "میاں گدھے اگر تم کسی صورت مجبوراً انگریزی [illegible] جاؤ تو وہ ہماری فیس کا انتظام کر سکتے ہیں۔ [illegible] کوشش (انھوں نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر کہا) میں دس سال سے [illegible] کی خدمت میں اسی طرح فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ معاملہ آسان نہیں۔

میں نے خدا کا نام لے کر انجمن کی دفتر کا رخ کیا۔ دروازے کی چق اٹھائی تو کرسی پر ایک موٹا تازہ سرخ و سفید ادھیڑ عمر کے آدمی تشریف فرما تھے جن کی صورت افغانیوں کی تھی۔ حلیہ مولویوں کا، شیروانی آئی۔ سی۔ ایس کی، مونچھیں جمعداروں کی۔ ٹوپی گاندھی پرستی۔ انھوں نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرے ہاتھ سے چق چھوٹ گئی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ مگر انھوں نے کہا آئیے آئیے تشریف لائیے۔ انکے ایسے الفاظ سے مجھے کچھ ڈھارس بندھی اور میں اندر داخل ہوا۔ دوستو! میں بڑے بڑے افسروں سے ملا۔ دیش بھگتوں سے ملاقاتیں کیں۔ حتیٰ کہ پنڈت جی نے شرفِ ملاقات بخشا۔ مگر میری جو کیفیت ان بزرگ کے دیدار سے ہوئی اس کا مجھے کبھی احساس بھی نہ ہوا تھا...... انھوں نے مجھے علی گڑھ تحریک، اسلام اور کمیونزم، سیاسیات اور عمرانیات، نفسیات اور جنسیات غرض ہر موضوع پر سمجھایا اور بار بار کہا "یہ باتیں میں سب لوگوں سے نہیں کرتا کبھی کبھار جب آپ جیسا کوئی ذہین گدھا ملتا ہے تو میں چند جملے کہہ دیتا ہوں۔ بڑا افسوس ہے میری بات کو سمجھنے والا ابھی تک کوئی نہیں۔"

میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ میرے گدھوں کی طرح سر ہلانے سے کم از کم فیس کا تو انتظام ہو ہی جائے گا۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی کہ لفظ حاجت زبان پر لاؤں۔ ان بزرگ نے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگایا اور یک بیک بولے آپ تو عکسر [illegible] کی ضرورت معلوم ہوتی ہے؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انھوں نے فوراً کہا سر تو آپ بارہ بنکی کے لوگوں کی طرح ہلا لیں۔ میں نے کہا جی میں اسی خاک کا رہنے والا ہوں..... کہئے آپ کو قرض حسنہ چاہئے! جی ہاں! مگر آپ کا واپس کرنے کا ارادہ تو ہے نہیں! جی نہیں میں ضرور واپس کروں گا۔ مگر یہ تو آپ کے ہاں کی روایات کے خلاف ہے..... یعنی؟ اور اس کے بعد انھوں نے رجسٹر کھول کر میرے سامنے لسٹ رکھ دی جنھوں نے قرض حسنہ کی لمبی لمبی رقمیں ہضم کر لی تھیں۔ میں نے انھیں اپنی نیک نیتی کا لاکھ یقین دلایا مگر انھوں نے کہا ایسی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو لیڈر ہوں اور لیڈر سچا نہیں ہوتا...... میں نے کہا میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ انھوں نے کہا سچے آدمی قسم نہیں کھاتے..... میں نے کہا میں کسی کی گواہی دلا دوں۔ انھوں نے کہا چوروں کے گواہ گرہ کٹ...... تب میں نے کہا کہ میں پڑھ لکھ کر قومی اور ادبی اصلاحات لانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے تعلیم کی مضرت پر تقریر شروع کر دی۔

میں ان کی گفتگو میں مشغول تھا کہ اس کمبخت دشمن خر شیطان نے آ کر میرے کان اینٹھنا شروع کر دیئے۔ میرا اندر کا سانس اندر تھا اور باہر کا باہر۔ بے اختیار ڈھینچو ڈھینچوں منہ سے نکلنے والا تھا۔ منہ کھل چکا تھا کہ مجھے یاد آیا کیوں نہ لاحول پڑھ دوں۔ لہٰذا میں نے گھبرا کر لاحول پوری قوت سے پڑھ دی۔

ع گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے

خدا جانے ان بزرگ کو کیا غلط فہمی ہوئی کہ انھوں نے ڈنڈا اٹھایا اور میں نے دُم دبا کر بھاگنا شروع کیا۔ آج تک میں اسی واقعہ پر حیران ہوں اور حیران رہوں گا۔

ہر طرف سے ناکام ہو کر اور تھک ہار کر ہوسٹل پہونچا۔ طبیعت کند تھی۔ مگر یہاں جو گھاس نظر آئی تو دل کھیت کھیت ہو گیا۔ گھاس کی اسقدر فراوانی کبھی چاہا ابھی لوٹ لگاؤں۔ مجھے بھوک بھی سخت لگ رہی تھی اور چاروں طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بے اختیار یہ شعر آ رہا تھا ؎

چاروں طرف ہرا ہی ہرا
میں گدھا کچھ نہ چرا

مجھ سے یہ کیفیت برداشت نہ ہو سکی اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے چرنے پر جُٹ گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ چرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا ؎

ما از ایں لحظہ دمے خوشتر نیست
کہ ز نیک و بد اندیشہ و از کس غم نیست

اتنے میں میرے کان کے پاس سہلاہٹ ہوئی۔ دیکھا تو ایک ضعیف العمر شخص میرے کان میں گدگدی کر رہا ہے اور مجھ سے غصہ میں بگڑ کر کہہ رہا ہے کہ ابھی پرووسٹ سے شکایت دلا دوں گا۔ میں اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ ویسے بھی ایک تو میں گدھا، دوسرے فرسٹ ائیر فول۔ بعد میں معلوم ہوا یہ صاحب انچارج محکمہ گھاس پھوس ہیں اور بہت دنوں سے چلتے ہیں اور کان میں گدگدی سے مطلب محض سرزنش تھی۔

(دہشت کا کالم ۲)

(عرفان احمد [illegible] نے [illegible] پریس میں چھپوا کر ترتیب دیا — [illegible] ۲۸ - آفتاب ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا)